ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE: 2789-8784

ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com

ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.2(2024)
(April to June)

اُردو شاعری میں اثر پذیری کی روایت

Tradition of Effectiveness in Urdu Poetry

ڈاکٹر سیدہ طیبہ رباب

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، کارخانہ بازار، فیصل آباد

ڈاکٹر جاوید اقبال

ریسورس پرسن، شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr. Syeda Tayyaba Rubab

Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Graduate College for Women Karkhana Bazar, Faisalabad

Dr. Javaid Iqbal

Resource Person (Urdu), Allama Iqbal Open University Islamabad, Faisalabad

Abstract:

The traditions comes into existence by the creation of arts and literature and the literature is so vast, it has no boundaries. The experiences and consideration of the artists have proved it's dignity. The Urdu poetry have some deep corners of tradition which have been reflected the human nature and super nature. The dignity of human and humanity, the depth of love and the high inspiration of human spirit by pure love, the spirit or consciousness of some era by artists and the high concepts of grief, these elements of literary traditions are being discussed ideologically and romantically by the famous and great poets of Urdu literature Mir Taqi mir, Nazir akber abadi, Mirza Asadullah khan Ghalib, Akber alabadi, Moulana Hali and Allama Iqbal.in this article the effort is done to analyse these elements with real context of the great poets and with the reference of tradition of literature.

Keywords: Traditions, Effectiveness, Poetry, Deep Love, Human Dignity, Spirit of the Era, Spiritual Purity, Great Poets, Self-Consciousness, Emotions, Self-Purity

روایت کو لمحات میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیقی تسلسل کی پختگی روایت کو جنم دیتی ہے۔ ایک تخلیق کار مستقبل کی تخلیقات کے لیے نئی راہیں متعین کرتا ہے۔ جو آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ روایت کی عمارت سے کسی ایک تخلیق کار کی کاوش نکال دی جائے تو اس میں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ روایت کی پختگی اس امر کی دلیل ہے ہر دور کے نت نئے تجربات و مشاہدات اسے ثابت کر چکے ہیں۔ ”روایت یوں بنتی اور بدلتی ہے جب سینکڑوں شاعر برسوں تک اپنے خونِ جگر سے روایت کے درخت کی آبیاری کرتے ہیں تب جا کر کہیں تخلیق کا ایک سدا بہار پھول کھلتا ہے، جسے کوئی ولی کہتا ہے کوئی حافظ، سعدی، میر، غالب اور اقبال کہتا ہے۔“(۱)

تصورِ انسان کی روایت

اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی تو صوفیانہ نثر رواج پا چکی تھی۔ برصغیر میں صوفیانہ فکر اہلِ علم و فضل کے ذہنی ارتقا کا حصہ تھی۔ چنانچہ شاعری میں صوفیانہ اثر پذیری اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ تصوف چونکہ نفسِ انسانی سے بحث کرتا ہے اس طرح شاعری میں تصورِ انسان کی روایت در آئی۔ اگرچہ مختلف شعرا کے ہاں تصور انسان مختلف رہا لیکن یہ تصور اُردو شاعری کی روایت پر اثر انداز ہوا ''اُردو شاعری میں تصوف وحدت الوجود اور قلندری اور رندی کی روایات کی وجہ سے ایک انسان دوستی کی سطح رکھتا ہے۔ اس انسان دوستی میں دیر و حرم کی حد بندیوں سے بلندی، کفر و ایمان دونوں سے رواداری، رسم پرستی اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت نمایاں ہیں۔ آدمی کو انسان بنانے پر زور ہے۔''(۲) اُردو شاعری میں میر تقی میر کے ہاں پہلی بار انسان کا واضح تصور ملتا ہے۔ اُردو کے استاد شعرا انسان کی تذلیل پُر شکوہ کناں ہیں میر کہتے ہیں:

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پائمال ہوں اپنا(۳)

میر کے ہاں انسان کا اس عالمِ خاکی میں آنا اس کی تذلیل ہے۔ غالب بھی کم و بیش یہی کہہ رہے ہیں کہ اصل وجود تو وجودِ باری تعالیٰ ہی تھا پھر اس سے جدا ہو کر میرا الگ وجود بن گیا چنانچہ غالب کو اپنے ہونے پر افسوس ہے کہ اگر میں یہ نہ ہوتا تو وہ ہوتا جو وجودِ حقیقی ہے۔ یعنی انسان کا اس دنیا میں ہونا ہی اس کی توہین ہے۔ اقبال نے بھی ابتدائی طور پر یہی کہا کہ توحید بھی ہماری بدولت ہے لیکن ہم ذلیل و خوار ہیں تاہم اقبال نے یہ نظریہ ''شکوہ'' میں مسلمان تک محدود کر دیا۔ جو زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر، معاشرے کی ستم ظریفیاں سہہ کر، اپنی ذات کے کھرے کھوٹے کو پرکھتا ہے۔ میر کا انسان عشق کے خارزاروں میں خلوص و صداقت، وفا اور استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ برسوں کی مشقت اور ریاضت سے میر کا انسان خاک کے پردے کو چاک کر کے عالم نور تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو پہنچ کر خدا کو پالیتا ہے یہ بارِ خلافت اُٹھاتا ہے جو کائنات میں کوئی مخلوق نہ اُٹھا سکی یہ اس کی عظمت ہے۔ کائنات کی معنویت اسی کے دم سے ہے:

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا(۴)

''آدمی جب انسان ہو جائے تو وہ خلاصہ کائنات ہے وہ عشق کے راستے سے زندگی اور کائنات کی معنویت تک پہنچ جاتا ہے اور ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ میر کے ہاں عشق ایک تہذیبی اور اخلاقی قدر ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے۔''(۵) میر درد کا انسان خالق سے راز و نیاز کرتا ہے۔ کائنات کے رازوں سے باخبر، ہنگامہ ہائے زندگی سے بے نیاز، حیات بعد الموت کے راز بھی جانتا ہے۔ اس کی وسعت زمین و آسمان پر حاوی ہے، اس کا دل خدا کا گھر ہے:

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے(۶)

نظیر اکبر آبادی انسان کے اچھے برے دونوں روپ پیش کرتے ہیں اور انسان کے ہر روپ کی توقیر کرتے ہیں یہ بھی صوفیانہ فکر کا ایک پہلو ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کا جلوہ ہے۔ نظیر کی نظم ''آدمی نامہ'' اس کی مثال ہے:

ابدال و قطب ، غوث و ولی آدمی ہونے　منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے　حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی(۷)

''نظیر کے یہاں آدمی بہر حال آدمی ہے خواہ فرشتہ ہو خواہ شیطان۔ دوسرے الفاظ میں نظیر کے یہاں آدمی کے عام روپ کا نہ صرف احساس ہے بلکہ انھوں نے اسے بے چون و چرا تسلیم بھی کر لیا ہے۔''(۸) مرزا غالب کا انسان وسیع المشرب ہے۔ عظمتِ آدم کا امین ہے۔ اللہ سے شکوہ کناں ہے فرشتوں کی گواہی سے نالاں، عرش سے پرے اپنا مکاں رکھنے کی آرزو ہے، خود شناسی اور احساسِ ذات میں حد سے بڑا ہوا کہ درِ کعبہ سے اُلٹا پھر آتا ہے اور خود کو وجودِ واجب کا حصہ سمجھتا ہے۔ اس عالمِ رنگ و بو میں مقید ہونا اس کی توہین ہے لیکن مقامِ انسانیت پانے کے لیے اسے محنت درکار ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا(۹)

غالب مردم گزیدہ ہیں اور ابنائے زمانہ سے نالاں ہیں۔ ہم عصروں کی شکایت کرتے انھیں اپنے نابغۂ روزگار ہونے کا پورا احساس ہے۔ آسماں کو دشمنی کا سبب گردانتے ہیں تو پس منظر میں وہی ابنائے زمانہ کی دشمنی ہے۔ غالب نے انسان کے ہر روپ کو دیکھا، اس کا مشاہدہ اور تجربہ بھی کیا۔ ''غالب کی شاعری میں ہمیں ایک آزاد مرد کی تصویر ملتی ہے جس کے تخیل کی کمند یزداں شکار بھی ہے اور عالم گیر بھی۔''(۱۰) غالب کے ہاں انسان کے اندر خیر اور شر، عشق و ہوس، حسن اور فریبِ حسن ہر پہلو نمایاں ہیں۔ غالب کے ہاں ابوالہوسی کا بیان بھی ہے اور مسائل تصوف بھی۔ انسان کے ارضی و سماوی ہر دو روپ نظر آتے ہیں۔ غالب خود ایک آزاد رو اور آزاد منش انسان ہیں۔ وفاداری بشرطِ استواری ان کا ایمان ہے لیکن مذہب کی قید نہیں۔ ''غالب مذہب سے صرف توحیدِ وجودی اور رسول اللہ ﷺ اور آئمہ اطہارؑ کی محبت کو لے لیتے ہیں اور باقی ہر رسم اور ہر قید سے بغاوت کرتے ہیں۔''(۱۱) اس طرح غالب کے تصورِ انسان میں وسعت، ہمہ گیری اور جاذبیت ہے۔ ان کا انسان فطری کمزوریوں کا حامل ہے، استقامت و حوصلہ کی لازوال مثال، حال کا شاکی اور مستقبل کے لیے پُر اُمید، زندہ دلی غالب کے انسان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کا انسان حالات کی ستم ظریفیوں کا شکار ہے۔ فرد سے لے کر نظامِ حکومت تک ہر چیز انقلاب کی زد میں ہے اور اکبر کا انسان انقلاب کی تاب نہیں لا سکتا۔ ذہنی تذبذب کا شکار ہے۔ تہذیبی تصادم نے اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اپنی اقدار کھو بیٹھا ہے اور غیر کی اقدار سے ناواقف ہے انھیں اپنانے میں روح اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ نیا نظام اس کے لیے سوہانِ روح ہے لیکن اسے قبول کرنا اس کی مجبوری ہے۔ مشرق و مغرب کی آویزش میں الجھا ہوا یہ لخت لخت انسان خود کو سمیٹنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اکبر کی رگِ ظرافت اس انسان کی مادی و معنوی زندگی کے ایک ایک رُخ کو طنز کا نشانہ بناتی ہے۔ شاید کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے جو تہذیبِ مغرب کی نقالی کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اکبر اسے زخمی وجود کا احساس دلا کر تبدیلی کا عمل اس کے شعور پر چھوڑ دیتے ہیں۔

حالی کے ہاں انسان کا تصور چوکس و چوکنا، انسان ہے۔ جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔ سادہ دل ہے، مبتلا بھی ہو جاتا ہے، محبت کرنے والا ہے، ماضی سے گہرا تعلق رکھتا ہے، حال کی ستم ظریفیوں سے آگاہ، اصلاح کا متمنی "اس نے اقبال کے تصورِ انسان کے لیے راہ ہموار کی جو بیسویں صدی کے پہلے نصف تک اُردو شاعری کے نقطہ عروج کی نشاندہی کرتا ہے۔"(۱۲) درحقیقت اقبال کا مثالی انسان آج اکیسویں صدی کے ربع اوّل میں بھی ناپید ہے، اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوا۔ اقبال کے بعد فیض احمد فیض اور ن۔م راشد کا بھی تصورِ انسان ہے لیکن یہ تصور، اقبال سے آگے کی منزل نہیں۔ اقبال کا انسان وہ ہے جس کے لیے وہ عظمتِ آدم کے ترانے گاتے ہیں۔ اسے احساسِ خودی دلاتے ہیں جس کے لیے چار سو ہی نہیں، لازماں ولامکاں بھی اس کے امکانات میں ہیں۔ اقبال اپنی آہِ سحر گاہی میں اس انسان کو اپنا نصیب تلاش کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کا جذبِ گستاخ اور شوقِ بے باک ہے جو دامنِ یزداں چاک کرنے سے بھی گریزاں نہیں۔ کبھی عزلت گزیں تو کبھی رونقِ محراب و منبر۔ اس کے شوق پر قدسیوں کو رشک آتا ہے۔ یہ خدائی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اقبال کے انسان کا دوسرا رُخ مثالی ہے۔ تصورِ انسان اپنے اندر صدیوں کی روایت کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ انسان خود شناس ہے۔ خودی کے مراحل طے کر چکا ہے۔ یہ مثالی انسان بے نیاز ہے، قناعت پسند ہے۔ بلند نظر ہے، صاحبِ بصیرت ہے، صاحبِ عشق ہے، قوتِ تسخیر رکھتا ہے، صاحبِ فقر ہے، یہ مردِ مومن صفاتِ الٰہی کا مظہر ہے۔ بحر و بر اس کی ہیبت سے لرزہ براندام ہیں۔ اس کا فقر خانقاہی نہیں شبیری ہے۔ رزم و بزم میں گرم اور نرم ہے۔ یہ وقت کے فرعون کے مقابل حکمتِ کلیمی رکھتا ہے۔ یہ کائنات کا راز ہے لیکن اس مردِ کامل کی خودی ابھی نمودار نہیں ہوئی۔ ساری کائنات، خود وجودِ باری تعالیٰ اس کا منتظر ہے:

"وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ"(۱۳)

(اور وہ (اب اسی مہلت کی وجہ سے) کہتے ہیں کہ اس (رسول ﷺ) پر ان کے رب کی طرف سے کوئی (فیصلہ کن) نشانی کیوں نازل نہیں کی گئی، آپ فرما دیجئے: غیب تو محض اللہ ہی کے لیے ہے، سو تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔) اقبال اس مردِ کامل کے انتظار میں ہیں۔ عالمِ انسانیت کی نجات اسی انسان کے ہاتھ میں ہے:

سوارِ اشہب دوراں بیا فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامہ ہا آباد شو در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
در عالم بیار ایّام صلح رابدہ پیغامِ صلح(۱۴)

اقبال کا انسان خاک سے آزاد ہے، یہ جہان اس کے لیے تنگ پڑ جاتا ہے۔ اس کا مقام مہ و ستارہ سے کہیں آگے ہے، گردوں اس کی زد میں ہے۔

عشق کی روایت

اسی طرح اُردو شاعری میں عشق کی روایت بھی بڑی زرخیز اور معنی زرخیز ہے۔ اُردو پر فارسی شعری روایت کے اثرات مرتب ہوئے۔ برصغیر میں بھی فارسی شاعری کا رواج عام تھا، لہٰذا وہی کلاسیکی روایات، تشبیہات و استعارات اور تراکیب جو فارسی شاعری میں رائج تھیں۔ اُردو میں در آئیں۔ ولی دکنی سے ابتدا کریں تو ان کے ہاں حسن پرستی زیادہ اور عشق کا لطیف تصور کم ہے۔ ولی

کا کلام سوز عشق سے عاری ہے اگرچہ روایت کے طور پر عشقیہ اشعار ضرور کہے ہیں۔ میر تقی میر کے تصورِ عشق میں گہرائی، صداقت، خلوص، شوق در شوق، جنون، کلاسیکل روایت کے لوازمات کے ساتھ موجود ہیں۔ میر کے عشق میں انسانی اور ماورائی ہر دو سطح پر عشق، انسانی جذبات و احساسات سے متعلق بھی ہے اور میر کا ایک حرکی تصور بھی ہے، جو عشق کی دین ہے۔ میر کا عشق، آدابِ جنوں سکھلا کر انسان کو تہذیبِ نفس سے اس طرح آراستہ کرتا ہے کہ غبارِ عاشق بھی محبوب سے فاصلہ رکھتا ہے۔ یہ عشق، ہوس پر منتج نہیں ہوتا بلکہ فرد کا تزکیہ کر کے اسے آدابِ درویشی سکھلاتا ہے:

دور　　بیٹھا　　غبارِ　　میر　　ان　　سے
عشق　　بِن　　یہ　　ادب　　نہیں　　آتا(۱۵)

میر کے ہاں عشق زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر ہے لیکن اس دور کی تہذیبی شکست و ریخت انسانی اقدار کی شکست کا باعث بنتی ہے:

اس　　عہد　　میں　　الٰہی　　محبت　　کو　　کیا　　ہوا
چھوڑا　　وفا　　کو　　اُن　　نے　　مروت　　کو　　کیا　　ہوا(۱۶)

میر نے بار بار دہلی کو تاراج ہوتے دیکھا اور انسانیت کی تذلیل کا مشاہدہ کیا۔ جب انسانی خون پانی کی طرح ارزاں ہو تو اس عہد میں محبت کیسے پنپ سکتی ہے۔ محبت ایک لطیف جذبہ ہے جو رومانوی فضاؤں میں پروان چڑھتا ہے۔ میر کا عہد ان فضاؤں سے محروم ہے۔ گھر جو محبت کا گہوارہ تھا، اب نہیں رہتا اسی لیے میر کہتے ہیں:

اب　　خرابہ　　ہوا　　جہاں　　آباد
ورنہ　　ہر　　اک　　قدم　　پہ　　یاں　　گھر　　تھا(۱۷)

سو میر کا عشق، اس دور کی اعلیٰ قدر نہ بن سکا بلکہ کبھی بھی عشق سماجی قدر نہ بن سکا۔ اقبال کہتے ہیں:

ہوئی　　نہ　　عام　　جہاں　　میں　　کبھی　　حکومتِ　　عشق
سبب　　یہ　　ہے　　کہ　　محبت　　زمانہ　　ساز　　نہیں(۱۸)

مرزا غالب کا تصورِ عشق لادوا درد بن کر زندگی کو پُر سوز بنا دیتا ہے لیکن یہ سوز گوشہ نشینی نہیں سکھاتا بلکہ بحرِ پُر آشوب میں غوطہ زنی کا حوصلہ دیتا ہے۔ مرزا غالب زندگی کے شاعر ہیں اور ان کا تصورِ عشق بھی حیات افروز اور ہمت افزا ہے۔ اگرچہ یہ عشق غالب کے ہاں بے اختیار ہے لیکن سوزِ غم کا ماخذ ہے، جہاں سے اسرارِ حیات پھوٹتے ہیں۔ غالب کے عشق کا تصور صحت مند روایت کو جنم دیتا ہے۔ عاشق اپنے صدق و خلوص کے باوصف اپنا حقِ زندگی برقرار رکھتا ہے۔ خوددار ہے، گھٹ گھٹ کے نہیں مرتا بلکہ سُبک سر بن کے سرگرانی کا سبب پوچھنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے:

یہی　　ہے　　آزمانا　　تو　　ستانا　　کس　　کو　　کہتے　　ہیں
عدو　　کے　　ہو　　لیے　　جب　　تم　　تو　　میرا　　امتحاں　　کیوں　　ہو(۱۹)

عشق کی اعلیٰ روایت میں ایک عاشق صادق حیات و کائنات کے سارے مسائل کو عشق کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ حضورِ عشق میں شہود، شاہد و مشہود ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ عشق اس زندگی اور حیات بعد الموت کو محیط ہے۔ اسی عشق کی روایت میں حالی سا، سادہ دل بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالی جدت پسند ہونے کے باوجود عشق و عاشقی کی روایت کو خوب نبھاتے ہیں:

ہوتی　نہیں　قبول　دعا　ترکِ　عشق　کی
دل　چاہتا　نہ　ہو　تو　زباں　میں　اثر　کہاں(۲۰)

میر، غالب، حالی عشق کی ایک مشترکہ قدر رکھتے ہیں جو کہ جذبِ عشق کا بے اختیار ہونا ہے۔ اقبال کے ہاں عشق و زندگی لازم و ملزوم ہیں، عشق حرکت اور عمل پیہم کا نام ہے۔ یہ عمل پیہم روح کے ارتقا کا سفر ہے، زندگی مسلسل محوِ سفر ہے۔ اقبال کے نزدیک رُک جانا موت ہے، دل کی موت، روح کی موت، روح کا ارتقا طبعی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اقبال کا عشق لازماں ہے جو عاشق کو لازماں کر دیتا ہے۔ اس کی تقویم میں اور زمانے بھی ہیں، جنھیں لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زمین و آسماں کی بے کرانی اس عشق کے لیے محدود ہے۔ اُردو شاعری کی روایت میں عشق کہیں سطحی ہے کہیں گہرا، کہیں معاملہ بندی کی حد تک اور کہیں آفاق کی وسعتوں پر حاوی لیکن عشق بجائے خود ایک جذبِ پابند کے طور پر قدرِ مشترک ہے۔ اقبال تک آتے آتے عشق کی معنویت بدل جاتی ہے۔ اگرچہ آج بھی شاعری میں عشق کا مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے بلکہ عشق ایک استعارہ بن کر شاعری کا روحِ رواں بن چکا ہے لیکن اقبال جس قوت سے کشمکشِ حیات میں حرکت و عمل کا کام لیتے ہیں، اسے عشق کا نام دیتے ہیں۔ تاہم اس عشق کا مرکز بھی دل ہے۔ البتہ یہ دل، روایت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اقبال نے عشق کو روحانی ارتقا سے تعبیر کیا ہے۔ جو اپنی اصل میں مقدس ہے:

عقل　و　دل　و　نگاہ　کا　مرشدِ　اولیں　ہے　عشق
عشق　نہ　ہو　تو　شرع　و　دیں　بتکدۂ　تصورات(۲۱)

اقبال نے عشق کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کے ہاں جہدِ مسلسل کا محرک جذبہ اور سوزِ حیات، جو زندگی کو عمل پیہم کی قوت بخش کر سفر پر گامزن رکھے، وہ عشق ہے۔

سماجی شعور کی روایت

اپنے دور کے تہذیبی و سماجی حالات، ہر بڑے شاعر کے کلام میں ایک روایت کے طور پر موجود ہیں۔ میر تقی میر کا سماجی شعور، بادشاہوں کی گدائی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پل بھر میں تخت نشینی، خاک نشینی میں بدل جاتی ہے۔ دہلی کی تباہی و بربادی میر کے نظام احساس کا ایک مستقل جزو ہے۔ میر کے ہاں دل و دلّی باہم ہم آغوش ہیں۔ ”میر کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو دو بنیادی علامتوں کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے، دل اور دلّی۔ دل انسان کا وہ مرکز ہے جس کے آئینے میں میر زندگی اور کائنات کا جلوہ دیکھتے ہیں اور دلّی اس تہذیب کا دل، جو مٹ رہی ہے۔ دل اور دلّی کے افسانے نے ان کی شاعری کو وہ آہنگ دیا جو اٹھارہویں صدی کی روح کا آہنگ ہے اور جس نے ان کی شاعری کو اس دور کی روح کا ترجمان بنا دیا۔“(۲۲)

دل　اور　دلّی　گرچہ　ہیں　دونوں　خراب
یہ　کچھ　لطف　اس　اجڑے　نگر　میں　بھی　ہے(۲۳)

دل عشق میں بربادی کے بعد حقیقی معنوں میں زندگی کو محسوس کرتا اور اس سے سکون پاتا ہے۔ گویا تلاطم تھم جانے کے بعد سکون لطف آور ہے۔ کم و بیش یہی حالت دلّی کی ہے۔ مرزا غالب کا تہذیبی شعور بھی اسی دہلی کا درد ہے جہاں صدیوں پرانی روایات دم توڑ رہی ہیں کہ مرزا غالب سا خوش طبع انسان بھی خونِ چشم کو روک نہیں پاتا:

جوئے　خوں　آنکھوں　سے　بہنے　دو　کہ　ہے　شام　فراق

میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں(۲۴)

غالب کی چشمِ بصیرت ایک قلزمِ خوں اور اس سے آگے بھی کئی طوفاں اُمڈتے دیکھ رہی ہے۔ شب غم نے غالب کو خاموش کر دیا ہے، وہ اس طوفان کو روک نہیں سکے لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ غالب کا شعور اس تہذیبی شکست کے طوفاں کو یاد کر کے آج بھی فکری ہدایت کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ غالب کی فکری شمع، انسانیت کی ہر سیاہ رات میں دلیلِ سحر ہے لیکن دہلی کی بربادی پہ خاموش ہے، وہ دہلی جو کبھی زندگی کا مرکز تھی اب مرحوم ہو گئی۔ حالی بھی اس مرحوم دہلی کا درد محسوس کرتے ہیں:

تذکرۂ دہلیٔ مرحوم کا اے یار نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز(۲۵)

حالی اجڑی ہوئی دلّی میں دورِ عروج کا نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے رہے۔ اگرچہ انھوں نے بدلتے ہوئے تہذیبی دھارے کے ساتھ چلنے کی بھی کوشش کی اور ان یگانوں کی طرح زندگی کرنے کی تلقین بھی کی جو نووارد تھے لیکن حالی اپنا درد ضبط نہ کر سکے:

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لُٹّس ہے گل چیں یا ہے قزاقی(۲۶)

مرزا داغ کا شہر آشوب ان کے تہذیبی شعور کا غماز ہے۔ داغ جیسا عشق باز بھی اپنے سماجی حالات سے لاتعلق نہ رہ سکا۔ داغ نے شہر آشوب میں اپنے دور کے بدلتے ہوئے حالات کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے آشیاں کی بربادی کے ساتھ دہلی کی تباہی کا مشاہدہ بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ سماجی شعور کی یہ روایت اکبر تک پہنچ کر ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کا مرکز و محور سماجی انقلابی ہے۔ انھوں نے بدلتے ہوئے تہذیبی نظام کو شدید طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ درحقیقت اکبر کا دور تہذیبی تصادم کا نقطہ آغاز ہے۔ وہ اس تہذیبی طوفان کو اُمڈتا ہوا دیکھ رہے ہیں جو تہذیبِ مشرق کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اکبر اس کے مضر اثرات کی نشاندہی کر رہے ہیں لیکن اس سیلاب پہ بند نہیں باندھ سکتے۔ اس لیے کہ مقامی اقوام ذہنی غلامی اور اخلاقی و روحانی تنزل کا شکار ہو چکی ہیں۔ ایسی حالت میں مغرب کی تہذیبی یلغار کا حملہ تیر بہدف ہے۔ آخر اکبر اس تہذیبی انقلاب اور بدلتے ہوئے سماجی حالات کے آگے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں لیکن اس حوالے سے جو کام وہ نہ کر سکے وہ ان کے فکری فرزند اقبالؒ نے کیا۔ بانگِ درا سے مثنوی پس چہ باید کرد، تک شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں اقبال نے تہذیب مغرب کے مضرات کو آشکار نہ کیا ہے۔ اقبال قیام مغرب کے دوران اس کی اقدار کا بغور مشاہدہ کر چکے تھے۔ وہ انگریز کے مکر و حیلہ سے بھی واقف تھے، اس کے استعماری ہتھکنڈوں سے سخت بیزار اور اس کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ اقبال نے اپنے دور کے سب سے بڑے عفریت کو نشانہ بنا کر سماجی شعور کی اس روایت کو توانائی بخشی۔

تصورِ غم کی روایت

تصورِ غم بھی اُردو شاعری کی روایت کا مستقل حصہ ہے جسے ہر شاعر نے منفرد اسلوب بخشا بالخصوص استاد شعرا نے ہر دور میں غم کو نئی معنویت سے ہمکنار کیا۔ میر کے ہاں دل کی ویرانی غم کو جنم دیتی ہے۔ پھر دہلی کا تہذیبی زوال ایسا نگر ہے جو دوبارہ آباد نہیں ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ اس تہذیب کی جگہ نئی تہذیب لے رہی ہے۔ دل اور دلی دونوں کی بربادی، انفرادی اور اجتماعی سفر میں خوں چکاں ہے۔ یہ خوں میر کی شاعری کا ایندھن ہے ایسا ایندھن جو جل کر راکھ نہیں ہوتا بلکہ زندگی کو متحرک کر کے ایک نئے اُفق سے

ہمکنار کرتا ہے۔ میر کا غم ایک نسخہ کیمیا ہے جو قلب و روح کا تزکیہ کر کے انسانی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ میر کا غم کاٹتا نہیں بلکہ وسعت اور ترفُّع سے ہمکنار کرتا ہے۔ اسی غم کے باعث میر کی شاعری اپنا خاص رنگ رکھتی ہے جو حساسیت اور دردمندی سے تعبیر ہے۔ "اس رنگ میں غصہ نہیں غم ہے، بلند آواز تلقین نہیں، نرم گفتار فہمائش ہے۔ خطابت نہیں سرگوشی ہے، اعلان نہیں نکتہ سنجی ہے، تلوار نہیں نشتریت ہے، فلسفہ نہیں فکر محسوس ہے، تصوف کی بازی گری نہیں، صوفیانہ مزاج کی دلداری اور دل آسائی ہے۔ تپتے ہوئے سورج کی جھلستی ہوئی گرمی نہیں، شبنم میں نہائی ہوئی خشک راتوں کی لطافت ہے۔ روزِ روشن کی بے رحم دھوپ نہیں، ایک خواب آلود چاندنی ہے۔"(۲۷) مرزا غالب نے غم کی روایت کو جدت و ندرت بخشی ہے۔ ان کا غم اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ قیدِ حیات و بندِ غم سے موت ہی رہائی دلا سکتی ہے۔ ان کا غم زندہ رہنے کا حوصلہ دیتا ہے وہ غم کو روگ نہیں بناتے بلکہ اس سے جوہرِ حیات کشید کرتے ہیں، ان کا آشوبِ غم حوصلہ مندی کا متقاضی ہے۔ اس غم کا ماخذ غمِ عشق یا غمِ روزگار ہے۔ دل کو ایک غم سے بہر حال دوچار ہونا ہے، یہی دل کی زندگی ہے۔ اس غم کے مختلف رنگ ہیں، کبھی مسیحا کی تلاش میں ہے تو کبھی منت کشِ دوا نہیں ہوتا۔ یہ کبھی فرد کا غم ہے اور کبھی اجتماع کا۔ غالب اظہارِ غم میں عار محسوس نہیں کرتے، درد و غم سے معمور دل کو آنسوؤں کے سیلاب سے پاک کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

اقبال کا غم خوابِ جوانی کو بیدار کرتا ہے۔ دل کے راز منکشف کرتا ہے، روح کا اک نغمۂ خاموش بن کر زندگی میں موسیقیت پیدا کرتا ہے۔ سوزِ دل اور سوزِ عشق بن کر ان کی شاعری میں رواں دواں ہے۔ یہی سوز و گداز اقبال کی شاعری کو منفرد تاثیر عطا کرتا ہے۔ اقبال غم کو سوہانِ روح نہیں بناتے یہ غم جذبِ عشق کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ اقبال کا غم اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے ہر نقش کو دوام عطا کرتا ہے۔ اقبال کے تمام تصورات کی روح میں یہی غم کار فرما ہے جو کہ انسانیت کا درد اور دردِ مسلسل ہے۔ میر، غالب اور اقبال اپنے اپنے دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے ادوار کے باقی شعرا کی روایت، انہی کا حصہ بن جاتی ہے۔ صوفیانہ فکر اور حیات بعد الموت کی بھی ایک پختہ روایت اُردو شاعری کا حصہ ہے جسے میر، غالب اور اقبال نے اپنے اپنے دور میں اپنے منفرد اسلوب میں بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء، ص:۲۹۷

۲۔ آل احمد سرور، پیچان اور پرکھ، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء، ص:۶۲

۳۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر اُردو، (مرتبہ)، ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۳ء، ص:۱۱۶

۴۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۵۔ آل احمد سرور، پیچان اور پرکھ، ص:۶۳

۶۔ میر درد، دیوان درد، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، مجلس ترقی ادب، س ن، ص:۸۸

۷۔ نظیر اکبر آبادی، کلیاتِ نظیر، لاہور، عبداللہ اکیڈمی، ۱۹۱۲ء، ص:۶۵۹

۸۔ آل احمد سرور، پیچان اور پرکھ، ص:۶۴۔۶۵

۹۔ غالب، مرزا، دیوانِ غالب، (مرتبہ)، امتیاز علی عرشی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء، ص:۱۷۲

۱۰۔ آل احمد سرور، پیچان اور پرکھ، ص:۶۸

۱۱۔ ایضاً، ص:۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص:۶۹

۱۳۔ سورہ یونس:۲۰

۱۴۔ اقبال، کلیاتِ اقبال (فارسی)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص:۴۵۔۴۶

۱۵۔ میر تقی میر، غزلیاتِ انتخابِ میر، (مرتب)، مولوی عبدالحق، لاہور: لاہور اکیڈمی، س ن، ص:۱۷

۱۶۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر، ص:۴۷

۱۷۔ میر تقی میر، غزلیاتِ انتخابِ میر، (مرتب)، مولوی عبدالحق، ص:۶۷

۱۸۔ اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص:۲۷۳/۴۸

۱۹۔ غالب، دیوانِ غالب، ص:۲۰۷

۲۰۔ حالی، دیوانِ حالی، لاہور، عبداللہ اکیڈمی، ۲۰۰۹ء، ص:۱۶۷

۲۱۔ اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص:۴۳۹/۱۱۵

۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو، جلد دوم، ص:۵۹۰

۲۳۔ میر تقی میر، کلیاتِ غزلیاتِ میر، ص:۳۲۷

۲۴۔ غالب، دیوانِ غالب، ص:۱۷۹

۲۵۔ حالی، خواجہ، دیوانِ حالی، ص:۱۱۵

۲۶۔ ایضاً، ص:۱۹۲

References in Roman Script:

1. Jameel Jalbi, Dr., Tareekh Adab Urdu, Volume II, Lahore, Majlis Tarraqi adab, 2005, p.297
2. All Ahmad Sarwar, Pahchan aur Parakh, New Delhi, Qaumi Council Baraye Farogh Urdu Zuban, 2013, p.62
3. Mir Taqi Mir, Kalyat-e-Ghazliat-e-Mir Urdu, (Martaba), Dr. Ali Muhammad Khan, Lahore: Al-Faisal Publishers, 2013, p.116
4. Ibid, p: 120
5. All Ahmad Sarwar, Pahchan aur Parakh, p.63
6. Mirdard, Dewan Dard, Author: Khalilur Rehman Dawoodi, Lahore, Majlis Traqhi Adab, Year 88
7. Nazir Akbarabadi, Kiliyat-e-Nazir, Lahore, Abdullah Academy, 1912, p: 659
8. All Ahmad Sarwar, Recognition and Analysis, p. 64-65
9. Ghalib, Mirza, Diwan-e-Ghalib, (Edition), Imtiaz Ali Arshi, Lahore: Majlis Targhee Adab, 1992, p. 172
10. Al-Ahmad Sarwar, Pahchan aur Parakh, p.68

11. Ibid, p: 65

12. Ibid, p:69

13. Surah Yunus: 20

14. Iqbal, Kalyat-e-Iqbal (Persian), Lahore, Iqbal Academi Pakistan, 1990, p. 45-46.

15. Mir Taqi Mir, Ghazliat-e-e-Ekhta-e-Mir, (compiled), Maulvi Abdul Haq, Lahore: Lahore Academy, S.N., p.71

16. Mir Taqi Mir, Kalyat-e-Ghazliat-i Mir, p.74

17. Mir Taqi Mir, Ghazliat-e-Ekhta-e-Mir, (Muratab), Maulvi Abdul Haq, p.76

18. Iqbal, Kiliyat-e-Iqbal (Urdu), p. 372-48

19. Ghalib, Diwan-e -Ghalib, p. 207

20. Hali, Diwan-e-Hali, Lahore, Abdullah Academy, 2009, p. 167

21. Iqbal, Kalyat-e-Iqbal (Urdu), pp. 439-115

22. Jameel Jalbi, Dr., Tareekh Adab Urdu, Volume II, p.590

23. Mir Taqi Mir, Kalyat-e-Ghazliat-i Mir, p.327

24. Ghalib, Diwan-e-Ghalib, p. 179

25. Hali, Khawaja, Diwan-e-Hali, p.: 115

26. Ibid, p: 192